ڈاکٹر خالد محمود خٹک

چیئرمین، شعبہ اردو، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

مغلیہ عہد سے جوش تک شعرائے اردو کی مخفی سیاسی جدوجہد

From the very beginning of Urdu poetry, Urdu poets raised their voice ot their level so that the dream of development which was in their mind could come true. For this, they mostly used Ghazal as their weapon. They invented a method of painful love experiences as a sign of their beloved. Because of which they remained safe from the direct punishment of the rulers.
This situation is still setup since the beginning of Urdu poetry and in this setup poets and after them, Mir, Soda, Dard, Ghalib, Zoaq, Hasrat, Faiz and Josh had contributed in their own style.
This hidden political struggle has gradually helped in the state of disturbance.

شعر و ادب کو معاشرتی زندگی میں اہم مقام حاصل ہے۔ کسی ملک اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف اداروں اور شعبوں کا عکس اس کی ادبیات میں جھلکتا ہے۔ سیاسی اور معاشرتی اداروں کی ذات میں معاشرہ اپنے آپ کو پہچانتا اور اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ ادیب ان اقدار و روایات کے پاسبان ہوتے ہیں جو کسی معاشرے کی روحِ رواں اور فکر و عمل کی مظہر ہوتی ہیں۔ اقبال نے شعراء کو "دیدہء بینائے قوم" کہا ہے تو میر تقی میر نے اس فرقے کو اسرارِ حیات کا بے لاگ و بے باک ترجمان قرار دے کر ان کی معاشرتی اہمیت واضح کی ہے۔

ادیبوں کا یہ ایک عالمگیر مسلک ہے اس میں کسی خاص ملک، خطے یا معاشرے کی تخصیص نہیں ہے۔ البتہ زبان و بیان اور اسالیبِ فن مختلف ہو سکتے ہیں کیونکہ ہر علاقے کے لوگ اپنی زبان میں محسوس کر سکتے ہیں اور احساسات شعر و ادب کی بنیاد ہیں۔ احساسات کی روحِ لطیف یعنی شاعری باقی اصناف و ادبیات سے زیادہ معاشرتی زندگی کی دھڑکنوں کے قریب ہے اور اس کے سلسلہء تخلیق کو عام معاشرتی زندگی کے مطالعے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ شعر و ادب کی تخلیق انسان کی اس فطری خواہش کے تابع ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات سے دوسروں کو آگاہ کرے۔ اس میں کلام نہیں کہ شاعری صلہ و انعام سے بلند تر چیز کا نام ہے۔ بقول شبلی نعمانی

"وہ ایک آگ ہے جو مشتعل ہوتی ہے، ایک چشمہ ہے جو خود ابلتا ہے، ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے" صلہ و انعام، "داد و دہش" اور تحسین و آفرین سے اس کو کوئی تعلق نہیں"۔ [۱]

اردو شاعری میں عملی مقاصد کے لیے منظم کام کا سلسلہ علی گڑھ اور انجمن پنجاب کے زیر اثر شروع ہوا۔ اس کے بڑے بڑے علم بردار سرسید احمد خان، آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی تھے۔ حالی صرف اسی شاعری کو شاعری تسلیم کرتے ہیں جس سے

سوسائٹی کے اجتماعی مقاصد میں مدد ملے اور شبلی نے قبائلی عربوں کی شاعری کو سند بنا کر اس کے عملی پہلوؤں کو بار بار واضح کیا ہے۔ قومی اصلاح کے اس زمانے میں ان خیالات میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی۔ ان شعراء کے علاوہ اس دور اور مابعد کے دوسرے شعراء نے بھی ان خطوط پر چل کر افادیت اور مقصدیت کو اپنے فن کا جزو بنا لیا لیکن ان خیالات کو بروئے کار لانے میں جبریت کا کوئی اصول نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ شعراء کے وجدان واحساس میں قومی تحریک کی امنگ پیدا کر کے اسے شعروادب کی آزادانہ تخلیق کی راہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ البتہ مغرب کے نئے نئے تنقیدی نظریات کی درآمد کے ساتھ ساتھ جبریت کے رجحانات بھی یہاں پیدا ہونے لگے اور قدیم دَور کی شاعری کو جاگیرداری دَور کی پیداوار قرار دے کر نظروں سے گرایا جانے لگا حالانکہ افادیت کا جہاں تک تعلق ہے شاعری قدیم ہو یا جدید اپنے عہد کے معاشرے کی تہذیب کے ساتھ ساتھ اس کے مستقبل کی تعمیر میں بھی حتیٰ المقدور حصہ لیتی رہی ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا دَورِ اوّل تاریخی لحاظ سے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے شروع ہوتا ہے اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں جنرل ہیگ کی یلغارِ دلی تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر چہ اس کی طبعی مدت اس سے بھی کم ہے یعنی محمد شاہ کے سال جلوس "۱۱۳۱ھ /۱۷۱۹ء) سے لے کر پانی پت کی تیسری جنگ (۱۱۷۴ھ–۱۷۶۱ء) تک۔ اس طویل عرصے میں مغلوں کے سیاسی نظام کا تانا بانا بکھر چکا تھا۔ پائے تختِ دہلی، پُرآشوب، ہولناک اور عبرت انگیز ڈرامے کا اسٹیج بنا ہوا تھا جو سالہا سال سے ملک بھر میں کھیلا جا رہا تھا۔ تیموری شہزادوں کی رزم آرائیاں، تخت نشینی کی مسلسل جنگیں، درباری سازشیں، امراء اور وزراء کے عزل ونصب کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ایک مدت سے جاری تھا۔ مسلسل لامتناہی کشت وخون کی گرم بازاری نے ہندوستان کے معاشرتی نظام کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ زندگی کے سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی، اور مجلسی نظام کو پارہ پارہ کر کے انسانی قدروں کو بیخ سے اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں اقتصادی نظام کی ابتری اور معاشی بدحالی نے مل کر لوگوں کے محاسنِ اخلاق کو گھن لگا دیا اور معاشرتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ان الم انگیز حالات میں ایک گروہ البتہ ایسے افراد کا بھی تھا جس کی تعداد اگر چہ نہ ہونے کے برابر تھی لیکن جس کا شعور واحساس بیدار تھا جو اس سیاسی وعمرانی اختلاط پر غور وفکر کر کے اس سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیر بھی سوچ رہا تھا۔ علماء میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی عظیم شخصیت اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کی اصلاح وتجدید کے منصوبے بنا رہی تھی۔ اس دَور کے شعراء بھی ان تکلیف دہ حالات میں اپنی زندگی کے تلخ ایام گزار رہے تھے جن میں ہر کس وناکس مبتلا تھا لیکن ان کا ذہن نہ صرف اپنے دکھ درد کے احساس سے متاثر تھا بلکہ اپنے ماحول اور معاشرے کی، اجتماعی مصیبتوں اور پریشانیوں سے پوری طرح آگاہ اور ازحد متاثر تھا۔ اس آگاہی اور تاثر نے اس دَور کے شعراء اردو کے کلام میں حزن ویاس اور درد وغم کی بے پناہ ٹیسیں بھریں۔ اس درد وغم میں اتنی گہرائی ہے کہ اس میں معاشرے کے ہر فرد کی دلی کیفیتوں کا انعکاس اور ہر شخص کی داستانِ الم کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس آگہی اور احساس نے اس دَور کے شعراء کی زندگی کو تلخ تر اور عیش ونشاط کو ان کے لیے خواب خیال بنا دیا تھا۔

اس شعور اور آگہی، جذبہ واحساس اور درد وغم نے اس دَور کے اردو شعراء کے فن میں عظمت اور آفاقیت پیدا کر دی۔ فرد کا ذاتی درد وغم بھی بڑی موثر چیز ہے لیکن جب اس کے ڈانڈے اجتماعی درد وغم سے جا ملیں تو اس میں آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو شعراء پر کم وبیش ایسے ہی حالات گزرے ہیں۔ وہ انفرادی طور پر بھی ان حالات سے دوچار تھے اور اجتماعی آلام ومصائب کا بھی گہرا احساس رکھتے تھے۔ اس انفرادی اور اجتماعی درد وغم نے ملکر اس دَور میں اردو شاعری کو معاشرے کی حقیقی ترجمانی عطا کر دی تھی۔

اردو شعراء نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کے سرسری سے ذکر پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید وتبصرہ بھی کیا ہے، جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے غافل یا بے گانہ نہیں تھے۔ نہ ہی وہ

اپنے ماحول کے تماشائی یا محض ترجمان تھے بلکہ وہ اپنے عہد کے نقاد بھی تھے۔ انہیں اپنے عہد کی سیاسی افراتفری، معاشی بد حالی، معاشرتی بے راہ روی، اخلاقی پستی، اور انسانی قدروں کی بیخ کنی کا دوسروں سے کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ وہ اس زوال پذیر سیاسی و سماجی صورتِ حال سے مطمئن نہیں تھے۔ انتشار پذیر نظام کی خامیاں اور نقائص بتا کر دل سے اس کی بہتری کے خواہاں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی یہ خواہش ایک انفرادی آواز کے دائرے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی کیونکہ اس کے لیے ملک میں کسی اجتماعی سیاسی یا معاشرتی تحریک کا وجود نہ تھا۔ صرف مغل سلاطین کا قائم کردہ جاگیردارانہ نظامِ حکومت تھا جس سے بہتری کی کچھ توقع ہو سکتی تھی لیکن وہ نظام تو باہمی رزم آرائیوں کی بدولت خود ہی پارہ پارہ ہو کر ناکارہ ثابت ہو چکا تھا۔ مغلوں کی سیاسی قوت کے منتشر ہونے کے ساتھ ہی ملک میں امن و امان کا زمانہ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا اور سیاسی ابتری سے ملک کی اقتصادی حالت مخدوش بلکہ درہم برہم ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال کو جمیل جالبی یوں واضح کرتے ہیں۔

> ''اکبر کا بنایا ہوا تہذیبی اور سماجی ڈھانچا شاہجہان کے دور میں اپنے عروج کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ کر تاج محل، لال قلعہ، شاہی مسجد اور نظیری، صائب و کلیم کی شاعری میں ظاہر ہو کر، تھک کر اتنا چور ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لیے نظامِ خیال کے مزید ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن منفی سماجی قوتیں اسے اتنی بری طرح دبائے رکھتی ہیں کہ کوندے کی طرح لپکتا خیال، متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرنے والی قوت، زندگی میں حرارت پیدا کرنے والا عمل ایک رسم، ایک رواج بن کر سوکھنے اور مرجھانے لگتا ہے۔'' ۲

اس اجتماعی نظام کی خرابی سے بھی زیادہ الم انگیز حالت یہ تھی کہ افرادِ معاشرہ جن سے اجتماعی نظام میں بہتری کی امید وابستہ کی جا سکتی تھی، اپنے انفرادی کردار کی خوبیوں، فکری بصیرتوں اور عملی قوتوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اردو شعراء حکومت اور سلطنت سے زیادہ معاشرے کے انفرادی اخلاق و کردار، ضمیر داری اور تطہیرِ نفس کے خواہاں تھے جس کی مدد سے آلامِ روزگار کا مقابلہ کر کے معاشرے کی اجتماعی صورت کو دوبارہ سمت الرّاس پر ڈالا جا سکتا تھا۔ بہر کیف شعراء اردو اپنے عہد کے پُر آشوب حالات سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ان حالات کے محض ترجمان ہی نہیں بلکہ نقاد بھی تھے۔ وہ خواہ عشق و عاشقی کے رنگین ترانے الاپ رہے ہوں یا درد و غم کی داستان سنا رہے ہوں، ان حالات سے قطعی بے تعلق نہیں رہ پائے بلکہ وہ ترانوں اور داستانوں میں اپنے عہد کی زندگی پر نقد و تبصرہ کرتے رہے۔ محبوب کی کج ادائی اور بے وفائی میں اپنے معاشرے کے عام افراد کی کج روی اور بے ضمیری کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ دل کے لٹنے اور اس کی ویرانی و بربادی کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس تذکرے میں ہندوستان کے شہروں اور نگروں کے لٹنے، ویران ہونے خصوصاً دار السلطنت دہلی کی تباہی اور بربادی کا نقشہ صاف نظر آتا ہے۔ ان کی داستانِ دل میں جو درد و غم اور حزن و یاس پایا جاتا ہے وہ محض ان کی داخلی واردات اور کیفیات پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں سیاسی نظام کی ابتری، اقتصادی بد حالی، معاشرتی انتشار، انسانی قدروں کے زوال، حیاتِ انسانی کی کم مائیگی، ارزانی اور ان سب باتوں کے مجموعی اثر سے جو رنج و ملال، درد و غم ہر سوچنے والے انسان کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے، اس سے عبارت ہے۔ آلامِ روزگار نے اس دور میں معاشرے کے ہر فرد اور ہر طبقے کو متاثر کیا تھا۔ شاعروں کو اپنے غم کے علاوہ معاشرے کے اجتماعی درد و الم کا بھی احساس تھا جس کی وجہ سے یہ طبقہ سب سے زیادہ متاثر اور پریشان تھا۔

اس دور کے شعراء نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو مختلف اصنافِ سخن میں پیش کیا۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطع، مسدس، شہر آشوب وغیرہ، لیکن دیگر اصنافِ نظم کے مقابلے میں غزل اس دور میں اردو شاعری کی سب سے اہم اور مقبول صنف سخن تھی۔ غزل کی مخصوص زبان اور ایمائی انداز، شدید واردات و کیفیات کے اظہار کا سب سے بہتر ذریعہ ہیں۔ اس زمانے میں شخصی

اقتدار کا احتساب واستبداد واشگاف بات کرنے کی اجازت نہ دے سکتا تھا اس لیے شاعروں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے غزل اور تغزل سے کام لیا۔ رمز وکنائے اور ایجاز واختصار سے جو درد وغم کے اظہار کی بہترین اور فطری صورت ہے، اپنے ماحول کے نشیب وفراز کو پیش کیا۔ اس دَور کے تقریباً ہر قابلِ ذکر شاعر نے شہر آشوب لکھا جس میں صراحت وتفصیل سے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر نقد وبحث کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور کے اردو شعراء اپنے ماحول کے نشیب وفراز سے کتنے باخبر اور ان کے نتائج سے کتنے متاثر تھے اور پھر ان تاثرات کو اپنے فن میں سمو کر ان اسرار ورموز کی نقاب کشائی کر رہے تھے جنہیں لب تک لانے کی کسی دوسرے صاحبِ کمال میں ہمت وجرأت نہ تھی۔

ملک اور ملکی عوام کو مسلسل آلام ومصائب کے قلزمِ خوں سے گزرنا پڑا۔ شاعر بھی عوام کے ساتھ اسی قافلہء بے سروساماں میں شامل تھے۔ انہوں نے اس قلزمِ خوں سے گزر کر جس داستانِ حیات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا اس میں ان کی آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، اگر غور کیا جائے۔ شاعر جہاں گلستان، باغ، چمن اور آشیاں کا ذکر کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ کنایۃً اپنے ملک، وطن اور گھر بار کا ذکر بھی کرتا ہے۔ ظالموں، قاتلوں، لٹیروں، اور غارت گروں اور کبھی گل چیں اور کبھی صیاد کا ذکر بھی اس کی مثال ہے۔ اسی طرح اردو شعراء نے غزل کے آب گینے میں رودادِ دل بیان کرتے ہوئے محض دل کی رام کہانی کے اوراقِ پریشاں بیان نہیں کیے بلکہ اس میں ملک اور معاشرے کی حکایتِ خونچکاں بھی شامل ہے۔ شاعروں نے دل کے استعارے میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کو سمو کر بڑے بلیغ کنائے سے کام لیا۔ زیرِ نظر دَور میں ہندوستان کا مرکزِ سلطنت شہر دلی تھا جو صدیوں سے اس ملک کے دل کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا۔ جس نے کئی انقلابات دیکھے، سینکڑوں حکمرانوں کو تخت وتاج کی زینت بنتے اور ان میں سے اکثر تاجداروں کو خاک وخون میں لتھڑتے بھی دیکھا۔ اس کی تباہی نے انتظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا۔ طواف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ امن وامان کا زمانہ خواب وخیال بن گیا۔ دلی کی بربادی کو شاعروں نے کنایۃً دل کی ویرانی وبربادی سے تشبیہ دے کر سارے جسم یعنی کل ملک کی تباہی کی داستان بیان کی ہے۔ دلی کی شکست وریخت اور نظامِ سلطنت کے درہم برہم کرنے میں اس دَور کے بادشاہوں، امیروں، وزیروں منصب داروں اور ان کے کارندوں کی نااہلی وبزدلی کا بڑا ہاتھ تھا۔ جمیل جالبی اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ اس کا طبقہء خواص ناکارہ، بدچلن، عیش پرست، بے ایمان، خود غرض وخود پرست ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے زندگی کے بڑے مقاصد باقی نہیں رہے تھے۔ اس کی حبِ وطن بھی ذاتی غرض کے سامنے ہیچ ہو گئی تھی۔'' ۳

اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کی مسلسل اور خون ریز جنگوں میں لائق، دیانت دار، جفاکش اور دُور اندیش امراء کی بیشتر تعداد قضا کے گھاٹ اتر گئی۔ جو چند ایک بچ گئے انہوں نے دربارِ شاہی میں گویوں، بھانڈوں، مسخروں اور نقالوں کی اکثریت اور ان کا اثر واقتدار دیکھ کر عافیت اس میں سمجھی کہ ملکی معاملات سے کنارہ کش ہو کر اپنی حویلیوں میں گوشہ نشین ہو جائیں۔ اس عرصے میں جتنے بھی تیموری شہزادے سربراہِ سلطنت ہوئے ان میں سے کسی کو بھی جہاں رانی وجہاں بانی کا ملکہ نہ تھا۔ ان کی حیثیت شطرنج کے مہروں کی طرح تھی۔ ان کا تخت وتاج اور اسکے ساتھ ہی ان کی متاعِ حیات، ہوس پرست امراء کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ان کٹھ پتلی اور بے بصیرت حکمرانوں کی بدولت ملک کا سیاسی نظام پراگندہ ہو گیا تھا۔ اس عہد کی اردو شاعری اسی خون اور لہو سے رنگین ہے۔ شاعروں کو اس انقلابِ روزگار کا گہرا قلق وافسوس تھا۔ شعرائے اردو نے ان سیاسی کوائف اور مجلسی حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے عام زندگی کو بے نقاب کیا۔ ان حالات کا اندازہ اردو شعراء کے کلام سے بخوبی ہو

جاتا ہے جن سے شاعروں کے شعور و احساس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ان حالات میں ملکی و معاشرتی معاملات کو سدھارنے میں اپنی فنی صلاحیتوں سے کام لیا۔ جابجا بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کے طرزِ عمل پر تنقید کر کے عروج وزوال کے پُر تاثیر نقشے کھینچ کر عیش و نشاط کے متوالوں اور غرور و نخوت کے سرشاروں کو ان کے عبرت انگیز انجام سے آگاہ و باخبر کیا۔ ہندوستان میں مغلوں کے سیاسی زوال کے نتیجے میں جو سماجی بحران پیدا ہوا، وہ اس قسم کے احساسات و تصورات کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

آئے دن کے جنگ و جدال، کشت و خون، شہروں کی تباہی، بستیوں کی ویرانی، حویلیوں اور عالیشان محلوں کے جابجا کھنڈر، سرِ عام راہوں پر انسانی کھوپڑیاں، ایسے دل گداز اور عبرت انگیز مناظر تھے جو انسان کے قلب و ذہن پر زندگی کی ہیچ مقداری کا گہرا نقش بٹھاتے تھے۔ اس حقیقت کو جب شاعروں کا احساس ملا تو یہ ایک اہم معاشرتی تصوفی رجحان بن گیا۔ اس طرزِ فکر کا اثباتی پہلو یہ ہے کہ زندگی کے اسی عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر انسان خودسری اور نفس پروری سے توبہ کرے اور معاشرتی زندگی کا ایک مفید رکن بننے کی کوشش کرے۔ یہ ایک ایسی راہ ہے جو معاشرے کو دکھوں اور غموں سے نجات دلا کر اجتماعی فلاح و بہبود کی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ اردو شعراء نے اس رجحان کو معاشرے کے سامنے منفرد انداز میں پیش کیا۔

مرزا سودا کا قطعہ ''در بیان پہرہ'' امورِ سلطنت کے بارے میں سیاسی اعتبار سے بڑا، اہم اور معنی خیز ہے۔ اس "پہرے" کے ضمن میں بڑے بلیغ پیرائے میں اس زمانے کی شورش، بدامنی، سیاسی اور سماجی حالت پر اپنے مخصوص انداز میں طنز کی ہے۔ دراصل اس طنز میں سلطنتِ مغلیہ کی ابتری، نظم و نسق کی خرابی اور اس کے اثر سے عمومی زندگی میں پیدا ہونے والے خوف و ہراس اور گھٹن کی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے آگرہ کے پس منظر میں انسانی اقدار کی پامالی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اس کے لیے انہوں نے شعراء میں مقبول صنفِ سخن غزل کے بجائے نئے پیرایۂ اظہار ''نظم'' کو منتخب کر کے معاشرتی حالات کی سنگینی کا احساس دلایا اور ایک فرض شناس شاعر کی حیثیت سے ایوانِ اقتدار تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی کہ عوام الناس کی ابتری کو بہتری میں بدلنے کا فریضہ حکمرانوں ہی کو ادا کرنا ہوگا ورنہ یہ ابتری مزید پھیلتی چلی جائے گی۔ اس پس منظر میں انہوں نے بطور تنبیہ بار بار یہ بات کہی کہ اقتدار کی نعمتیں ملنے کے باوجود بادشاہ اور حکمران محض آدمی کے درجے پر فائز ہیں۔ ان کی یہ عارضی بڑائی دراصل ان پر یہ ذمہ داری ڈالتی ہے کہ وہ اپنی خلوت گاہوں سے نکل کر ظلم و قہر کے ماحول کو جانچیں اور ایسی حکمتِ عملی اختیار کریں کہ عام آدمی کی مشکلات کم سے کم ہو سکیں۔ انہوں نے یہ کام بہت ذمہ داری کے ساتھ نئے نئے عنوانات کے تحت بار بار کیا۔ افسوس صرف اس قدر ہے کہ ان کی آواز کی گونج ان کے اپنے عہد میں محلات اور اونچے ایوانوں تک پہنچ کر اثر انگیز نہیں ہو سکی۔ اس صورتِ حال کو نظیر کے پس منظر میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس طرح لکھا ہے۔

> ''نظیر نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہمدرد اور انسان دوست شاعر کی نظر سے دیکھا تھا۔ اپنے عہد میں انسانی قدروں کے زوال، بنی آدم کی عام بے قدری اور ذلت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے فرض شناس معلّم اور ایک حساس باشعور فنکار کی طرح لوگوں کو تلقین اور ہدایت بھی کی۔'' [۴]

میر و سودا کے بعد دہلی کے نمائندہ شاعر غالب، مومن اور ذوق تھے۔ ان کے سیاسی ماحول کا مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی محفل ملکی انحطاط و انتشار کے درمیان قائم ہوئی۔ اس محفل کے اجڑنے پر دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑی اور جب کمپنی کے قبضہ کے بعد دہلی کے انتظامی امور کسی قدر، رو بہ اعتدال آ گئے تو یہاں دوبارہ شعر و سخن کا چرچا عام ہوا۔ غالب کا زمانہ تاریخ کا انتہائی پُر آشوب

دَورتھا۔ ہنگامہ دست خیز جاری تھا۔ ایک قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ عروس البلاد دہلی لٹ رہی تھی۔ شرفا ، امراء ذلیل وخوار ہوکر در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ ہزاروں بے گناہوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ عافیت کی خاطر لوگ اپنے گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔ دہلی کی بربادی پر داغ نے جو شہرِ آشوب لکھا وہ بہت اثر انگیز ہے۔ اردو شاعری میں اس کا اپنا ایک مقام ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی　　　بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہے کو تھا ، لاجواب تھی دلّی　　　مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں، جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حالِ بربادی　　　کہاں تک آہ کہوں آسماں کی جلّادی
کس کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی　　　کہ داغ داغ ہے دل ، ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دیکھیں ہم

غرض کہ اردو شعرا نے اپنی کاوشوں سے اردو شاعری کے اسالیب کو عملی طور سے بدلنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے اس کو جدید اصولوں سے آشنا کرنے میں معاون کردار ادا کیا۔ شعراء اردو نے محسوس کیا کہ قوم کو حسن وعشق کے فسانوں، چنگ ورباب کی صداؤں اور محفل طرازیوں میں مدہوش رہنے کے بجائے اس دَورِ حیات میں جب کہ دنیا عرصہء حشر بن چکی ہے۔ قوم کو اپنے وجود اور تحفظ کے لیے بیداری اور عمل کی ضرورت ہے۔ اس لیے شعراء نے عشق ومحبت کے بجائے قومی، اخلاقی اور سیاسی خیالات کے اظہار کو ضروری سمجھا۔ ان میں الطاف حسین حالی، اکبرالہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، علامہ اقبال، حسرت موہانی، فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی کے علاوہ دیگر شعراء اردو نے عملی سیاسی جدوجہد کی۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اسی جدوجہد کا عکاس ہے۔

اکبرآلہ آبادی نے بساطِ سیاست کا بغور مطالعہ کیا اور وہ سیاست کی چالوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ظالموں کو ظلم کی تصاویر دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مولانا محمد علی جوہر شعراء اردو میں ایک زبردست سیاسی لیڈر کے طور پر اپنی خدمات کو انجام دیتے ہوئے شاعری میں سیاسی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ ایک بے باک سیاسی لیڈر اور پختہ گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری بھی سیاسی اثرات سے بہت متاثر ہوئی۔ حکیم اجمل خان کا شمار بھی اردو شعراء میں صاحبِ کمال اور جامع الصفات ہستی کے طور پر ہوتا ہے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے حاذق، طبیب، ساتھ ہی ساتھ ایک شاعر اور سیاسی لیڈر تھے۔ جناب مسیح الملک مولانا محمد علی کی طرح ایک زبردست سیاسی وقومی لیڈر تھے ان کے جذبات کا اثر ان کے کلام میں موجود ہے۔

اقبال سیاسیات سے اگرچہ اپنا دامن بچانا چاہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ امیرِ کارواں، سالارِ قافلہ اور حکیم الامت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاست دان اور سیاسی مفکر بھی ہیں اور ان کو سیاسیاتِ عالیہ کے بعض اہم مباحث سے گہرا لگاؤ ہے۔ عبدالستار ردولوی، ڈاکٹر رفیق زکریا کی کتاب ''اقبال شاعر اور سیاست دان'' کے ''حرفِ آغاز'' میں اقبال کی سیاست سے متعلق لکھتے ہیں۔

''اقبال نے ابتدا ہی سے ہندوستانی سیاست میں اور عالمی خصوصاً ملی سیاست میں بھی دلچسپی لی۔ اقبال کی سیاست سے دلچسپی ان کی شاعری میں اور ان کے خطبات اور مختلف مواقع پر دیئے گئے انٹرویوز سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال کے سیاسی افکار ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں مدعو کیے گئے۔ اقبال کو

دیگر مسلم علماء سیاست کی طرح، سیاسی اہمیت بھی حاصل ہوئی۔'' ۵

اقبال کے بعد حسرت موہانی اردو ادب کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں سیاسی رنگ کی شاعری کی۔ وہ ایک عظیم المرتبت شاعر اور ناقد تھے۔ بے باک سیاسی لیڈر اور تحریکِ آزادی کے ایک مخلص سپاہی تھے۔ بحثیت سیاسی لیڈر انہوں نے انگریز دشمنی کی پاداش میں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور زندان میں چکی بھی پیسی، مگر ان کی مشقِ سخن وہاں بھی جاری رہی۔ حمیرا اسد وزئی نے حسرت کی سیاست اور شاعری کے اصلی عمل کی کیفیات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''حسرت فطرتاً ایک آزاد خیال انسان ہیں اور ملک کی سیاسی اور قومی کشمکش میں عملاً شریک ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری سیاست سے بہت کم واسطہ رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسرت کی شاعری کا اصل اصول حسن کاری ہے۔ وہ تلقین اور پروپیگنڈہ کو شاعری میں ٹھونسنے کے قائل نہیں، اسی اصول پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔ چنانچہ ان کے سیاسی خیالات بھی حسن کے ایسے حسین سانچوں میں سے نکلتے ہیں کہ شعر کے محرک جذبہ کی طرف ذہن آسانی کے ساتھ منتقل نہیں ہوسکتا۔'' ۶

دورِ حاضر میں ترقی پسند تحریک نے دنیائے شعر و ادب کو جو سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دیا وہ فیض احمد فیض ہے۔ فیض کی نظر مشرقی اور مغربی ادب پر بہت گہری ہے۔ مشرقی اور مغربی ادب کی اقدار مدغم ہو کر اس کے یہاں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ سوشلزم کے اثرات بھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ انہوں نے شعور کی توانائیوں کے ساتھ اس کو اپنی فکر کا جزو بنا لیا۔ دوسروں کی طرح آنکھیں بند کر کے اس رو میں نہیں بہے۔ انہوں نے ادب کی قدیم جاندار، روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس میں کچھ نئے تجربات کیے۔ پرانے پیمانوں میں نئی شراب پیش کی اور سیاسی نظموں میں تغزل کے رنگ کو پوری طرح نمایاں کیا۔ فیض کو جس طرح اپنا محبوب عزیز ہے، اس طرح اپنا وطن، اپنی قوم بھی پیاری ہے۔ کبھی وہ گیسوئے یار کے سایہ کے لیے تڑپتا ہے۔ تو کبھی لیلیٰ وطن کی چاہت میں زندان تک پہنچ جاتا ہے اس کا مزاج عاشقانہ، افتادِ طبع رومانی اور ذہن انقلابی ہے۔ آزادی سے پہلے انہوں نے آزادی کے خواب دیکھے اور اپنے تصور میں جنت جگائی تھی، مگر جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو تمام حالات یکسر تبدیل نہیں ہوئے اور نہ فوراً ہوسکتے تھے۔ فیض نے اسے شب گزیدہ سحر "داغ داغ اجالے" سے تعبیر کیا۔

''فیض نے قیامِ پاکستان کے بعد کی سیاسی فضاؤں میں نئی انقلابی ہوا کے جھونکوں سے فضا کے جمود کو توڑنے کی کوشش کی مگر اپنی شاعری کے آفاقی عناصر کو ساتھ رکھ کر قدیم اور جدید کی آویزش کے ساتھ فروغ دیا۔'' ۷

وہ مایوس ہو کر نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے ابنائے وطن کو جدوجہد جاری رکھنے اور آگے بڑھنے کا مشورہ دیا۔ حتیٰ کہ زنداں کی چار دیواری میں رہ کر بھی فیض نے لیلائے وطن کو ایسی تڑپ کے ساتھ یاد کیا، جیسے وہ اپنے محبوب کو یاد کرتا رہا ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں۔

''لیلائے وطن سے اپنے عشق کی واردات اور راہِ وفا میں اپنی ثابت قدمی کی روداد بیان کرتے وقت فیض نے لیلیٰ اور مجنوں کے روایتی کرداروں کو اپنے تمام تر علائم و رموز کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ اگر ہم فیض کے سیاسی مسلک اور فیض کی انقلابی جدوجہد سے آشنا نہ ہوتے تو یہ شاعری ہمیں سراسر روایتی اور رسمی شاعری نظر آتی۔ لیلائے وطن پر رقیب کے جابرانہ تسلط اور فیض کے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں چونکہ ہمارے زمانے کے جیتے جاگتے حقائق ہیں اس لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ فیض نے واقعتاً سنتِ منصور و قیس کو زندہ کیا ہے۔ ان کی جذباتی سرگزشت ہماری قومی تاریخ کی آئینہ دار ہے۔'' ۸

سیاسی اعتبار سے اردو شاعری کا دور غیر ملکی سامراج کے خلاف جارحانہ حملے کے سلسلے میں بڑا وقیع ہے۔ بیسویں صدی کے

شروع میں نوحوں اور مرثیوں کے برعکس اس دور میں وطن کی آزادی کے رجزیہ ترانے بہت زیادہ کہے گئے۔ ان ترانوں میں وطن کی عظمت کا احساس اور سامراج کے خلاف جذبہ بڑا شدید ہے ''بڑھے چلو بڑھے چلو'' کی مجاہدانہ للکار میں جمہور کے بڑھتے ہوئے جذبہء آزادی کی دھڑکن موجود ہے۔ یہ للکار جوش و خروش کے ابلتے ہوئے لاوے کو اور زیادہ آتش بنا دیتی ہے۔ ان رجزیہ ترانوں کے علاوہ بہت سے گیت بھی عوام کے جذبات و احساسات کو متحرک کر کے ان کی روح میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ دور بڑا پُر آشوب تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے سیاہ بادل برِ عظیم کے در و دیوار پر چھا رہے تھے۔ آزادی کی جدو جہد فیصلہ کن مرحلے تک پہنچ چکی تھی۔ محکوم ملک کے باشندے امید و بیم کی حالت میں عالمی بساطِ حرب و ضرب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ کانگرس موقع سے فائدہ اٹھا کر "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے لگا رہی تھی۔ برطانوی حکومت کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ جنگ جیتنے کے لیے ہندوستانیوں کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کیا جائے۔ جنگ کے دوران کرپس مشن اور جنگ کے فوراً بعد وزارتی مشن ہندوستان کے لاینحل سیاسی مسئلے کو سلجھانے کے لیے بھیجے گئے۔ سامراج کے آخری داؤ پیچ، جوڑ توڑ اور ملک کی سیاسی جماعتوں کے اختلاف بڑی شدید نوعیت کے تھے جن میں سمجھوتے کی راہ تلاش کرنا خاصا کٹھن مرحلہ تھا۔ یہ مختصر سا دور برِ عظیم کی آئندہ قسمت کے لیے فیصلہ کن دور تھا اور اس فیصلہ کُن دور میں کئی مرحلے اور کئی مد و جزر آئے۔ اردو شعراء کے سامنے یہ سب مراحل تھے۔ ان حالات میں بہت سی ہنگامی اور جذباتی نظمیں بھی لکھی گئیں۔ بہت سے رجزیہ ترانے اور گیت تخلیق کیے گئے۔ ان میں بہت سا رطب و یابس بھی ہے لیکن ان میں جو گرمیء ہنگامہ کی روح موجود ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور پھر بعض ہنگامی نظموں، گیتوں اور ترانوں میں بقائے دوام کے کچھ عناصر بھی موجود ہیں۔ ان ہنگامی چیزوں کے علاوہ اس دور میں کچھ نظمیں ایسی تخلیق ہوئیں جن میں پس منظر اگر چہ ہنگامی اور وقتی جذبہ تھا لیکن اپنی اہمیت و افادیت اور قدر و قیمت کے اعتبار سے یہ نظمیں برِ عظیم کی سیاسی تاریخ میں دائمی جگہ بنا گئی ہیں۔ اس قسم کی دو نظمیں جوش ملیح آبادی کی ہیں۔ ایک کا عنوان "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" ہے جو دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز (۱۹۳۹ء) کی تخلیق ہے۔ دوسری نظم کا عنوان "وقت کی آواز" ہے جو نومبر (۱۹۴۵ء) کی تخلیق ہے۔ یہ دونوں نظمیں اردو شاعری کا بیش بہا قیمتی سرمایہ ہیں۔

جوش نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" میں ان جذبات و احساسات کو سمو دیا جو اس وقت سارے ملک کے عوام کے سینوں میں مچل رہے تھے۔ یہ انگریز سامراج کے مظالم کی خونیں روداد ہے۔ کس طرح سامراجی غاصب ہمارے ملک میں تاجروں کے بھیس میں آئے اور اپنی عیاری اور مکاری سے خاکِ وطن پر قبضہ کر لیا، ہماری صنعت و حرفت، تہذیب و تمدّن کو پامال کر دیا۔ انہوں نے قید خانوں کو بھر دیا اور گڑھوں کو انسانی لاشوں سے پاٹ دیا۔ جوش خود کو شاعر انقلاب کہنے پر مصر ہیں حالانکہ ان کے لیے باغی لفظ زیادہ مناسب تھا۔ اصطلاحاً انقلاب سے مراد سیاسی تبدیلی ہے جو ارتقائی یا یک دم حکومت اور معاشرے پر اثر انداز ہو سکے۔ اس تعریف میں گھوڑوں کے لشکر سے آج کی سماجی حکومتی تبدیلی تک تمام تبدیلیاں مراد ہیں جوش کو انقلابی حالات حاصل تھے۔ یحیٰی احمد لکھتے ہیں۔

''جوش کو فیض نے رومانی فطرت پسند انقلاب پسند کہا ہے۔'' ۹

اگر چہ جوش کسی انقلابی پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ ان کا جھکاؤ کانگرس کی طرف تھا لیکن ان کی ترقی پسندی مسلمہ ہے۔ ان کی نظموں میں ایک انقلابی آن بان ہے۔ وہ جاگیردار طبقہ سے منسلک ہوتے ہوئے کچلے ہوئے طبقات کی شاعری کرتے ہیں۔ سرمایہ داری سے متعلق ان کے خیالات اٹل ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں۔

''یقین مانیے جب تک انسان (آدمی) حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار و

صنعت کارنہیں بن سکتا۔'' ۱۰

جوش نے مارکسزم کے مطابق مغربی استعمار، ایشیائی ملوکیت، عرب مطلق العنانیت اور آئیڈیل ازم کو رد کیا۔ عقلیت پسندی اور روشن فکری کو مانا۔ معاشرتی بیماریاں، عقل دشمنی، انسانی تقسیم، فرقہ واریت، تعصب، عیاری، بدکاری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ وہ بعض اوقات جذبات اور بغاوت کی رو میں اتنے بہہ جاتے ہیں کہ انقلابیت پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن وحدتِ فکر میں وہ انقلابی ہی ہیں۔ جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے اتنی ہل چل مچائی کہ شعلوں کو ہوا دی۔ نظم گلی کوچے پہنچی اور ضبط ہوئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس نظم کی شہرت اور اس کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے۔

''اس نظم کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ انگریزی اقتدار کے افسران بالا اس نظم سے اتنے ہراساں تھے کہ انہوں نے آزادی پسند عوام کی سماعتوں تک اس کے پہنچنے میں پابندی کھڑی کر دی۔ اس کے باوجود یہ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں تک پہنچ گئی۔'' ۱۱

اسی نظم سے جوش کو انقلابی پذیرائی ملی۔ بعد میں اسی تسلسل کی نظمیں یہ ہیں۔ شکستِ زنداں کا خواب، دامِ فریب، انقلاب کی آواز، مقتل کانپور وفاداران ازلی کے نام، آزادیء کامل، ان سب نظموں کی لے ایک ہے۔ انقلابی گھن گرج، للکار، خطابت، انگریز کو نکالنے کی سرتوڑ کوشش کے توسط سے جوش بغاوت کا جھنڈا لے کر میدانِ کارزار میں ہیں۔ انہوں نے حسینیت کو نئے معنی پہنا دیے۔ کربلا کے استعارے ہند کی آزادی کے لیے استعمال ہونے لگے۔ جوش کی شہرت انہی نظموں کی وجہ سے ہوئی۔ ان کے انقلابی کلام کو سمجھا جانے لگا۔ جوش کا انقلاب بغاوت تک ہے۔ ان کی نظموں میں تعمیرِ نو کی جھلک کم کم ہے، صرف تخریب نے پرچم کھولا ہے۔ ان کے غیض وغضب پر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

''نظم نعرہء شباب میں انہوں نے سامراجی نظام پر کھل کر وار کیا ہے۔ ان نظموں میں جوش کے مجاہدانہ تیور دیکھنے والے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل گیا۔ شعلے برس رہے ہیں۔ انہوں نے رنگینیوں کو للکارا اور سامراجی نظام کے پارہ پارہ ہونے کی نوید دی۔'' ۱۲

جوش گھن گھرج کے شاعر تھے۔ انہی الفاظ کے ذریعے قلمی جہاد کے لیے آگے بڑھے۔ جوش نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا وہ ایک ہنگامہ خیز دور تھا۔ ایک طرف عوام میں انگریز کے خلاف بغاوت کے جذبات تھے۔ دو جنگیں ہو چکی تھیں۔ سوویت انقلاب آ چکا تھا۔ انگریز کی وجہ سے فکری سطح پر علم و دانش کی ہوائیں چل چکی تھیں۔ تحریکِ خلافت جوش نے عین جوانی میں دیکھی تھی۔ اس کے بعد کے تمام حالات نظموں میں قلم بند کیے۔ جوش آزادی کے بعد بھی "ماتمِ آزادی" نظم لکھتے ہیں جس میں کالے انگریز سے نفرت ملتی ہے۔ وہ پہلے ہی ہندی قوم کو وحشی، روسیاہ اور ذلیل کہہ رہے تھے۔ ان کے انحراف اور جراتِ انکار کو ہند میں پذیرائی ملی۔ جوش کے انکار و انحراف پر زاہدہ حنا یوں رقمطراز ہیں۔

"جوش سماج کے مروّجہ عقائد اور رسوم و روایات سے انکار و انحراف کی مہیب قوت اور اسے بیان کرنے کی بے مثال قدرت رکھتے تھے۔'' ۱۳

لوگوں کو انقلابی نظمیں سنا کر جوش داد لیا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں پاکستان ان کے لیے سنگلاخ زمین تھا۔ جوش کے نزدیک "علی گڑھ تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بے تعلق ثابت کرنا تھا تاکہ اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی جائے کہ مسلمان کا دل حب وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے۔ اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے

اور انگریزی میں خواب دیکھے۔ وہ مغربیت اختیار کر کے مشرقیت سے اس قدر بے زار ہو جائے کہ اپنی معاشرت، زبان، اپنے ادب، اپنی روایات، اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل سمجھے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ جوش نے ایک انگریز آفیسر سے کہا

"میں آپ کی نوکریوں کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔ میرا یہ فقرا سن کے ٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تن کر کھڑے ہو گئے میں سمجھا باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے۔" ۱۴

غرض جوش اس مخفی تحریک کے اہم نقیب ہیں جس کا سلسلہ شعرائے اردو نے مغلیہ عہد سے ہی اپنے اپنے انداز میں فراہم کیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ شبلی نعمانی، مولانا، "شعر العجم"، جلد چہارم، مطبوعہ اعظم گڑھ، 1918ء، ص ۱۲۷

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع چہارم مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۷۵۔۷۴

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو"، جلد سوم، طبع دوم مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴

۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۵

۵۔ رفیق زکریا، ڈاکٹر، "اقبال شاعر اور سیاست دان"، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹

۶۔ حمیرا، سدوزئی، "جوش کی شاعری اور اس کا سیاسی پس منظر"، مقالہ ایم فل، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۲

۷۔ خالد محمود، خٹک، ڈاکٹر، "محمد حسین عنقا افکار و آثار"، مقالہ پی ایچ ڈی، جامعہ بلوچستان کوئٹہ، ۲۰۰۷ء ص ۲۴۴

۸۔ فتح محمد، ملک، "فیض شاعر اور سیاست"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۷

۹۔ یحییٰ احمد، "جوش کا لسانی مطالعہ"، پی ایچ ڈی مقالہ، پشاور یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۵

۱۰۔ جوش، ملیح آبادی، "یادوں کی بارات"، مکتبہ شعر و ادب، چوہدری اکیڈمی، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

۱۱۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، "جوش ملیح آبادی کے خطوط"، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰

۱۲۔ جگن ناتھ آزاد، "جوش کی باغیانہ شاعری اور نظریہ حیات"، مشمولہ "آج کل"، جوش نمبر، پبلی کیشن ڈویژن، حکومت ہند، اپریل ۱۹۹۵ء ص ۱۳

۱۳۔ زاہدہ حنا، "انکار و انحراف جراتِ فکر کی روایت"، مشمولہ ارتقا کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۶

۱۴۔ جوش ملیح آبادی "یادوں کی بارات"، مکتبہ شعر و ادب، چوہدری اکیڈمی، سمن آباد لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۲